بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم　　نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡم　　وَعَلٰی عَبۡدِہِ الۡمَسِیۡحِ الۡمَوۡعُوۡد

ماہنامہ　　انٹرنیٹ گزٹ

المنار

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ

جولائی 2011ء　　جلد نمبر1 شمارہ نمبر 7

مجلس ادارت　　مدیر : مقصود الحق　　معاون مدیر : مبارک احمد صدیقی وسید نصیر احمد

E-mail : editoralmanar@hotmail.com　　Ph. No. +44 (0) 20 87809026

ارشاد باری تعالیٰ

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ﴿۵۷﴾　　(الاحزاب)

یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم بھی اس پر درود اور خوب خوب سلام بھیجو۔

حدیثِ نبوی ﷺ

مَا مِنۡ مُسۡلِمٍ یُصَلِّی عَلَیَّ إِلَّا صَلَّتۡ عَلَیۡہِ الۡمَلَائِکَۃُ مَا صَلَّی عَلَیَّ فَلۡیُقِلَّ الۡعَبۡدُ مِنۡ ذٰلِکَ اَوۡ لِیُکۡثِرۡ۔

(سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا)

(ترجمہ) جو مسلمان مجھ پر درود بھیجتا ہے جب تک وہ اس کام میں لگا رہے فرشتے اس پر درود بھیجتے رہتے ہیں۔ اب بندے کا اختیار ہے کہ وہ درود کم پڑھے یا زیادہ۔

ملفوظات حضرت مسیح موعود علیہ السلام

ایک رات اس عاجز نے اس کثرت سے درود شریف پڑھا کہ دل و جان اس سے معطر ہو گیا۔ اسی رات خواب میں دیکھا کہ فرشتے آبِ زلال کی شکل پر نور کی مشکیں اس عاجز کے مکان میں لئے آتے ہیں اور ایک نے ان میں سے کہا کہ یہ وہی برکات ہیں جو تو نے محمدؐ کی طرف بھیجی تھیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔　　(براہین احمدیہ جلد اوّل صفحہ 576)

کلامِ امام

یَا رَبِّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ دَائِمًا
فِیۡ ھٰذِہِ الدُّنۡیَا وَ بَعۡثٍ ثَانِیۡ

★★★

مصطفٰے پر تیرا بے حد ہو سلام اور رحمت
اُس سے یہ نور لیا بارِ خدایا ہم نے
شانِ حق تیرے شمائل میں نظر آتی ہے
تیرے پانے سے ہی اُس ذات کو پایا ہم نے
آدمی زاد تو کیا چیز فرشتے بھی تمام
مدح میں تیری وہ گاتے ہیں جو گایا ہم نے

ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ

اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے پیار کو کھینچنے کے لئے، دنیا کی لغویات سے بچنے کے لئے، اس قسم کے جو فتنے اُٹھتے ہیں ان سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو دلوں میں سلگتا رکھنے کے لئے، اپنی دنیا اور آخرت سنوارنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بے شمار درود بھیجنا چاہئے۔ اس پُرفتن زمانے میں اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ڈبوئے رکھنے کے لئے، اپنی نسلوں کو احمدیت اور اسلام پر قائم رکھنے کے لئے ہر احمدی کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی سختی سے پابندی کرنی چاہئے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ○ (الاحزاب 57) کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم بھی اس پر درود اور سلام بھیجا کرو کیونکہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ (الفضل انٹرنیشنل 3 مارچ 2006)

قرآن کتب سابقہ کا مصدقّ کن معنوں میں؟

علمی نکات

’’مسیحی مشنریوں نے اس قسم کی آیات سے ایک انوکھا استدلال کیا ہے۔ اور وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان آیات سے یہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم موجودہ تورات و انجیل کو انسانی دستبرد سے پاک قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ کہنا کہ یہ کلام پہلے کلام کا مصدق ہے۔ صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ اب تک محفوظ بھی ہے ایک ایسا نتیجہ ہے جو الفاظ سے زائد ہے۔ اور زائد نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوتا۔ قرآن کریم تورات اور انجیل کی تحریف کے حوالہ جات سے بھرا ہوا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس پر ایک زبردست شاہد ہے۔ اگر واقعہ میں ان آیات کا وہ مطلب ہوتا جو یہ لوگ بتاتے ہیں۔ تو اس وقت کے مسیحی اور یہودی اس پر اعتراض کرتے۔ لیکن ایسا اعتراض ان کی طرف سے بالکل ثابت نہیں ہے بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ کہ آپ نے فرمایا کہ یہود کی کتب میں جو باتیں ہیں ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو۔ اگر ان کتب کو غیر محرف سمجھا جاتا تو ان کی تصدیق سے کیوں روکا جاتا۔

باقی رہا یہ کہ قرآن کریم نے ان کتب کا حوالہ دیا ہے سو یہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ کتب محرف نہیں ہیں۔ سب دنیا تاریخی کتب کا حوالہ دیتی ہے اور کوئی عقلمند کسی تاریخی کتاب کو شروع سے آخر تک صحیح نہیں سمجھتا۔ حوالہ سے مراد صرف اس خاص واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ نہ کہ سب کتاب کی‘‘ (تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ ۷۷)

مے کشو! تازہ کریں پھر سنّتِ بادہ، چلو!
سوئے میخانہ بہ حسب گرمیٔ وعدہ، چلو!

’’بعد اک مدت کے پھر آئی ہے یہ ٹھنڈی ہوا‘‘
اُڑ کے پہنچو، سر کے بل جاؤ کہ پا پیادہ چلو

چل پڑے سوئے سفر تو لوٹ کے کیا دیکھنا
ہو کے پھر بیگانہ ہائے منزل و جادہ چلو!

داد اور بیداد تو ہے منحصر توفیق پر
جام ہو، مینا ہو یا پیمانۂ سادہ-چلو!

عندلیبان چمن کو ہو نوید سرخوشی!
بزم آرا پھر ہوا پھولوں کا شہزادہ، چلو!

نور کب دیکھا کسی نے خاک آنکھوں سے حبیبؔ
اشک میں تبدیل کر کے دید کا مادہ چلو!

حضرت احمدؑ سے لیکر حضرتِ مسرور تک
میں تو ہوں ساحرؔ درِ اقدس کا دلدادہ، چلو!

(حبیب الرحمٰن ساحر-امریکہ)

جلسہ سالانہ اور ہماری ذمہ داریاں

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے فرمایا ہے:

’’جلسہ کے ایام بالخصوص ذکر الٰہی اور درود پڑھتے ہوئے گزاریں اور التزام کے ساتھ نمازوں کی پابندی کریں۔ اب اتنی دور سے مہمان تشریف لائے ہیں تو اگر نماز بھی نہ پڑھیں اور ان کی پابندی نہ کی تو پھر فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ اسی طرح انتظامیہ کیلئے یہ ہے کہ لنگر خانہ میں یا ایسی ڈیوٹیاں جہاں سے ہلنا ان کیلئے مشکل ہے وہاں نماز کی ادائیگی کا انتظام ہونا چاہئے اور ان کے افسران کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں۔

انگلستان کے احمدیوں کو چاہئے کہ ذوق وشوق کے ساتھ اس جلسہ میں شریک ہوں۔ یہ آپ کا جلسہ سالانہ ہے۔ بغیر کسی عذر کے کوئی غیر حاضر نہ رہے۔ بعض لوگ تین دن کی بجائے صرف دو دن یا ایک دن کیلئے آجاتے ہیں اور ان کے آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جلسہ کی برکات کے حصول کی بجائے میل ملاقات ہو۔ حالانکہ جلسہ کی برکات کو اگر مدنظر رکھا جائے تو تین دن حاضر رہنا ضروری ہے۔ جس حد تک ممکن ہو جلسہ کی تقاریر اور باقی پروگرام پوری توجہ اور خاموشی سے سنیں اور وقت کی قدر کرتے ہوئے کسی بھی صورت اسے ضائع نہ کریں۔

پھر یہ ہے کہ نماز کے دوران بعض اوقات بچے رونے لگ جاتے ہیں جس سے بعض لوگوں کی نماز میں بہرحال توجہ بٹتی ہے، خراب ہوتی ہے جو نماز کا تعلق تھا وہ جاتا رہتا ہے۔ تو اس صورت میں والدین کو چاہئے اگر والد کے پاس بچہ ہے یا والدہ کے پاس بچہ ہے کہ وہ اس کو باہر لے جائیں۔ یہ بہتر ہے کہ اس اکیلے کی نماز خراب ہو، بجائے اس کے کہ پورے ماحول میں بچے کے شور کی وجہ سے، رونے کی وجہ سے نمازیوں کی نماز خراب ہو رہی ہو۔ نیز اگر چھوٹی عمر کے بچے ہیں تو مائیں جو ہیں اگر یا باپوں کے پاس ہے تو باپ، پہلی صفوں میں بیٹھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ پیچھے جا کر بیٹھیں تا کہ اگر ضرورت پڑے تو نکلنا بھی آسان ہو۔

اسی طرح نمازوں کے دوران اپنے موبائل فون بھی بند رکھیں۔ بعضوں کو عادت ہوتی ہے کہ فون لیکر نمازوں پر آجاتے ہیں اور پھر جب گھنٹیاں بجنا شروع ہوتی ہیں تو بالکل توجہ بٹ جاتی ہے نماز سے۔ (خطبات مسرور جلد اول صفحہ 194)

اطاعت اور وفا ہو تو ایسی!

حضرت مسیح موعود علیہ السلام صاحبزادہ سید عبداللطیف شہید رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''جب مجھ سے ان کی ملاقات ہوئی تو قسم اس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں نے ان کو اپنی پیروی اور اپنے دعویٰ کی تصدیق میں ایسا فنا شدہ پایا کہ جس سے بڑھ کر انسان کیلئے ممکن نہیں۔ جیسا کہ ایک شیشہ عطر سے بھرا ہوا ہوتا ہے ایسا ہی میں نے ان کو اپنی محبت میں بھرا ہوا پایا، اور جیسا کہ ان کا چہرہ نورانی تھا ایسا ہی ان کا دل مجھے نورانی معلوم ہوتا تھا۔

اس بزرگ مرحوم میں نہایت قابل رشک یہ صفت تھی کہ درحقیقت وہ دین کو دنیا پر مقدم رکھتا تھا اور درحقیقت ان راستبازوں میں سے تھا جو خدا سے ڈر کر اپنے تقویٰ اور اطاعت الٰہی کو انتہا تک پہنچاتے ہیں اور خدا کے خوش کرنے کے لئے اور اس کی رضا حاصل کرنے کیلئے اپنی جان اور عزت اور مال کو ایک ناکارہ خس وخاشاک کی طرح اپنے ہاتھ سے چھوڑ دینے کو تیار ہوتے ہیں۔ اس کی ایمانی قوت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اگر میں اس کو ایک بڑے سے بڑے پہاڑ سے تشبیہ دوں تو میں ڈرتا ہوں کہ میری تشبیہ ناقص نہ ہو۔

اکثر لوگ باوجود بیعت کے اور باوجود میرے دعویٰ کی تصدیق کے پھر بھی دنیا کو دین پر مقدم رکھنے کے زہریلے تخم سے بکلی نجات نہیں پاتے بلکہ کچھ ملونی ان میں باقی رہ جاتی ہے اور ایک پوشیدہ بخل خواہ وہ جان کے متعلق ہو خواہ آبرو کے متعلق اور خواہ مال کے متعلق اور خواہ اخلاقی حالتوں کے متعلق ان کے نامکمل نفسوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی نسبت ہمیشہ میری یہ حالت رہتی ہے کہ میں ہمیشہ کسی خدمت دینی کو پیش کرنے کے وقت ڈرتا رہتا ہوں کہ ان کو ابتلا پیش نہ آوے۔ اور اس خدمت کو اپنے پر ایک بوجھ سمجھ کر اپنی بیعت کو الوداع نہ کہہ دیں لیکن میں کن الفاظ سے اس بزرگ مرحوم کی تعریف کروں جس نے اپنے مال اور آبرو اور جان کو میری پیروی میں یوں پھینک دیا کہ جس طرح کوئی ردی چیز پھینک دی جاتی ہے۔''

(روحانی خزائن جلد نمبر 20 تذکرۃ الشہادتین صفحہ 10)

سعید و جانثار، سرفروش و مرد کامراں
صداقتِ مسیحؑ کا لطیفؓ اِک نشان تھا
وفا کا نقش اوّلین، آبروئے عاشقاں
وہ سربلند حوصلے کی سرخرو چٹان تھا
(جمیل الرحمن)

بیٹوں کا تبادلہ منظور

(بحوالہ الفضل انٹرنیشنل لندن 15 فروری 2008)

حضرت مولانا دوست محمد شاہد صاحب مرحوم ایک دلچسپ واقعہ بیان فرماتے ہیں:

حضرت مصلح موعودؓ جن دنوں نخلہ (خوشاب) میں تفسیر صغیر تالیف فرما رہے تھے، خاکسار کو اچانک ربوہ سے خانقاہ ڈوگراں کے قریبی گاؤں کلسیاں جانا پڑا جہاں میرے ایک احمدی چچا اللہ بخش صاحب عرصہ سے مقیم تھے۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ ان دنوں میرے دادا صاحب بھی وہیں موجود تھے اور اگرچہ بڑھاپے نے ان کو بہت کمزور کر دیا تھا مگر ان کی احمدیت دشمنی بدستور عالم شباب پر تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ میں تمہارے خلیفہ صاحب سے مل کر فریاد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں واپسی پر سیدھا حضور ہی کی خدمت اقدس میں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنا پیغام دے دیں، جاتے ہی پہنچا دوں گا۔

انہوں نے درد بھرے دل سے مجھے کہا کہ میرے چھ بیٹے ہیں جن میں سے تین بچوں کو جن میں ایک حافظ قرآن اور دوسرے دو بھی بہت عقلمند اور صاحب علم ہیں تمہارے خلیفہ صاحب نے مجھ سے چھین لیا ہے اور باقی تین جوان پڑھ یا معذور تھے میرے حوالے کر دیئے ہیں۔ انہیں میری طرف سے درخواست کریں کہ انہیں تو گنتی ہی پوری کرتی ہے وہ تبادلہ کر لیں۔ میں قبر کے کنارے پر آپہنچا ہوں۔ اس آخری وقت میں یہ تقسیم میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔

میں ان سے ملاقات کے بعد ربوہ سے ہوتا ہوا سیدھا جا بہ پہنچا۔ اس دن مکرم چوہدری احمد جان صاحب کی قیادت میں ضلع راولپنڈی کے مخلصین اپنے محبوب و مقدس آقا کی زیارت کیلئے پہنچے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انہی کو شرف ملاقات عطا ہوا جس کے بعد خاکسار کو دربار خلافت میں حاضری کا موقع نصیب ہوا۔ تصرف الٰہی ملاحظہ ہو کہ حضور نے ازخود میاں محمد مراد صاحب کے اخلاص و خدمات کا تذکرہ شروع فرما دیا جس پر میں نے عرض کیا کہ خاکسار اپنے دادا صاحب کا ایک خصوصی پیغام لے کر آیا ہے کہ آپ نے میرے حافظ قرآن اور پڑھے لکھے بیٹوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میرے دوسرے ان پڑھ یا معذور بچوں سے تبادلہ کر کے اپنی گنتی پوری کر لیں۔

بعد میں مولانا عبدالرحمن صاحب انور پرائیویٹ سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ اہل راولپنڈی کی ملاقات کے دوران حضور بالکل خاموش رہے اور صرف مصافحہ کیا مگر جونہی حضور نے میرے دادا کا پیغام سنا حضور بہت مسکرائے اور حضور کا روئے مبارک خوشی سے تمتما اٹھا اور پیار بھرے انداز میں فرمایا کہ اپنے دادا کو میرا پیغام بھی پہنچا دیں کہ مجھے بیٹوں کا یہ تبادلہ بخوشی منظور ہے۔ آپ اپنے غیر احمدی بیٹے میرے حوالے کر دیں اور آپ کے احمدی بیٹوں کو میری طرف سے اجازت ہے۔ وہ احمدیت کو ترک کر کے آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں۔

حضرت مصلح موعودؓ کا یہ پیغام لئے میں اگلے دن واپس دادا جان کے پاس پہنچا اور انہیں مبارک باد دی کہ ہمارے امام عالی مقام نے بچوں کا تبادلہ منظور کر لیا ہے۔ لیکن جب میں نے پیغام کی تفصیل بتائی تو وہ زار و قطار بچوں کی طرح رونے لگے اور کہا تمہارے خلیفہ صاحب کتنے چالاک ہیں !!! انہیں یقین ہے کہ میرے مرزائی بیٹے تو کبھی ''مرزائیت'' کو نہیں چھوڑیں گے اس لئے اب وہ میرے دوسرے تین بیٹوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہیں۔ ہم لوگ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے مگر دادا صاحب نے دوبارہ شور و فغاں شروع کر دیا۔

زندان نامہ

رتن باغ سے ملتان جیل تک

دوسری قسط

(مظفر احمد مرزا sutton، لنڈن)

ایک دن کیا ہوا کہ اچانک ڈاکٹر عمر حیات ملنے چلا آیا۔ وہ میرا کالج فیلو ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں لیاقت میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ عمر حیات اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ میرا دوست ہے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کا بیٹا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ اپنے (جیل سپرنٹنڈنٹ) باپ سے کہہ دے کہ میرے دوست (مظفر مرزا) کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

سٹار ہوزری والے بابو اکبر علی صاحب کے بیٹے، میرا کرام اللہ صاحب جیل میں باقاعدگی سے آکر مجھ سے ملا کرتے تھے۔ میری جو بھی ضرورتیں ہوتیں ان کا بہت اچھی طرح خیال رکھتے۔ یہ سب لوگ میرے محسنوں میں سے ہیں۔ اللہ ان سب کو اپنے بے شمار فضلوں اور رحمتوں سے نوازے۔ کیا تم نے نوٹ کیا کہ خواجہ ذکاء اللہ اور میرا کرام اللہ جنہوں نے میری بہت مدد کی دونوں کے ناموں میں "اللہ" کا لفظ قدرِ مشترک کے طور پر موجود تھا۔

رشید! سزا تو مجھے 14 سال کی ہوئی تھی مگر جب میں اس کا 1/10 حصہ یعنی 14 ماہ کی جیل کاٹ چکا تو خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ہیومن رائٹس کے وکلاء کا ایک وفد آیا۔ میرے کیس کا جائزہ لیا اور پھر ہائر کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ اللہ نے خاص فضل فرمایا اور میری سزا کالعدم قرار دیدی گئی۔ مجھے یہ اطلاع ملی تو اللہ کے اس احسان پر میرے آنسو بہنے لگے۔ جیل کے ساتھی بھی اس خبر سے بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں محبت کے آنسو جھلملاتے دیکھے۔ ان میں سے بہاول پور کا ایک پڑھا لکھا نوجوان خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح میرے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اچھے خاندان کا تھا۔ اس کا باپ ایکسئین تھا۔ مجھے نماز پڑھتے اور تلاوت کرتے دیکھتا تو کہتا کاش میں بھی تم جیسا مسلمان ہوتا۔ اس بیچارے کو کیا پتہ کہ میں کتنا ادنیٰ اور معمولی سا انسان ہوں۔ الوداع کہنے والوں میں جیل کا وہ ساتھی بھی شامل تھا جس نے جیل میں مجھ سے حضرت مسیحِ موعودؑ علیہ السلام کی نظم سنی تھی۔ وہ دو بدمعاش جنہوں نے راوی روڈ پر احمدی ٹمبر مرچنٹ کی دوکان کو نذرِ آتش کیا تھا وہ بھی اپنے اس فعل پر شرمندگی کا اظہار کر کے معافی مانگا کرتے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ اللہ سے معافی مانگو اور جب جیل سے نکلو تو ان احمدیوں سے معافی مانگ لینا جن کی دوکان کو تم نے آگ لگائی تھی۔

جیل حکام رہا ہونے والوں کی لسٹ لے کر آئے تو سرِ فہرست نام میرا تھا۔ پھر چند نام اور تھے۔ حکام ہمیں آفس میں لے آئے۔ وہ کپڑے جو بوقتِ گرفتاری پہنے ہوئے تھے، ہمارے حوالے کئے۔ مجھے اب بھی یاد ہے مَسٹر ڈرنگ کی قمیص تھی، پتلون زِین یا ڈیکران کی تھی اور چند سِکّے۔ یہ تھی کُل جائیداد۔ ایک بہت ہی قیمتی چیز منصور بی ٹی کا خط اور کچھ ناقابلِ فراموش یادیں خواجہ ذکاء اللہ صاحب اور میرا کرام اللہ صاحب جیسے محسنوں کی تھیں۔

جیل سے الوداع ہوتے ہوئے خواجہ ذکاء اللہ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ وہ میرے عظیم محسن تھے۔ انہوں نے میرا کرام اللہ صاحب کو مطلع کیا ہوا تھا۔ میر صاحب جیل کے باہر اپنی کار میں میرے منتظر تھے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ کھانا تیار تھا۔ ایک سال دو ماہ بعد گھر کا پکا ہوا کھانا نصیب ہوا۔ کھانے کے بعد میر صاحب مجھے ملتان ریلوے سٹیشن لے آئے جہاں سے مجھے ٹرین پر لاہور جانا تھا۔ میرا کرام اللہ صاحب اُس قابلِ فخر بیٹی کے قابلِ فخر باپ تھے جس نے برقعے میں کیمبرج سے پی ایچ ڈی کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

ملتان سے لاہور کے لئے فقط ٹرین ہی روانہ نہ ہوئی بلکہ اس کے ساتھ سوچوں کی "تیز گام" بھی سرپٹ دوڑنے لگی۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ آگے چل کر کیا کرنا ہے؟ کدھر جانا ہے؟ انہی سوچوں اور خیالوں میں گُم بالآخر لاہور آ گیا۔ میں ٹرین سے اُترا۔ جب نسبت روڈ پر پہنچا تو اپنے دوست عبداللطیف (بیگم پوری جو آجکل آسٹریلیا میں ہوتے ہیں) کا خیال آیا۔ وہ ٹھیکیداری کرتے تھے۔ ان کی دو منزلہ کوٹھی خاصی وسیع تھی۔ جس میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ میں ان سے ملا۔ انہوں نے گرمجوشی سے خوش آمدید کہا اور اپنے ہاں ٹھہرنے کی پُرخلوص دعوت دی، جو میں نے کچھ پس وپیش کے بعد قبول کر لی۔

14 ماہ کی اسیری سے لے کر بریت تک جو حالات گزرے انہوں نے میرا ایمان چٹان کی طرح مضبوط کر دیا۔ خدا کے علاوہ نہ کسی انسان سے مدد مانگی، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ اللہ کا فضل ہی تھا جو ہر موقعے پر اپنی رحمتوں کے در کھولتا چلا گیا اور میں اُس کا شکر ادا کرتے ہوئے انہیں قبول کرتا چلا گیا۔

گو کہ اب میں آزاد تھا، مگر جیل کے 14 مہینوں نے میری صحت پر کاری ضرب لگائی تھی۔ جیل سے باہر آنے کے بعد میں جسم میں نقاہت اور کمزوری محسوس کرتا تھا۔ رگوں میں دوڑنے والا خون بھی ساتھ نہ دے رہا تھا۔ اور دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ تھی کہ ڈاکٹر کو دکھانے کیلئے پھوٹی کوڑی بھی پاس نہ تھی۔ میں نے ماہر امرضِ قلب ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کو لکھا کہ کیا ممکن ہے کہ آپ ادھار پر مجھے دیکھ سکیں؟ اُس زمانے میں اُن کی فیس 50 روپے ہوا کرتی تھی۔ یہ جون 54 کی بات کر رہا ہوں۔ گو کہ دورانِ قید حضرت میاں صاحبان کی صورت میں یوسف ایک نہیں بلکہ دو ملے۔ مگر جیل سے باہر آکر ملنے والا یہ یوسف میرا جسمانی مسیحا بن گیا۔ میری رُوداد سنی۔ بڑی

محبت اور ہمدردی سے میرا چیک اپ کیا۔ دل کی دھڑکن سُنی۔ الیکٹرو کارڈیوگرام کیا اور کہا کہ دل کی فکر نہ کرو دل تو تمہارا بالکل ٹھیک ہے۔ انشاء اللہ اسے کچھ ہونے کا نہیں۔ البتہ ٹیکے لکھ رہا ہوں لگوانے شروع کردو۔ ٹیکے بھی شاہ میڈیکوز والوں سے اُدھار پر ہی لگوائے۔ ٹیکوں نے اللہ کے فضل سے جادو کا سا اثر کیا۔ لگتا تھا کہ زندگی پھر سے عود کر آئی ہے اور میں دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔

اب اور سنو کہ کام کے سلسلے میں اللہ کا فضل کس رنگ میں ظاہر ہوا۔ اس کے لئے نہ ہی کچھ تگ ودو کرنی پڑی اور نہ ہی انتظار۔ جلد ہی شاہنواز لمیٹڈ میں خاصی معقول تنخواہ پر کام مل گیا۔ ان کی بورنگ کمپنی تھی۔ ایک جرمن (ہائنز ایکر مین) ہمارا جنرل مینیجر تھا ایک دن یوں ہوا کہ میں شام ہو جانے کے بعد بھی دفتر میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ جنرل مینیجر آ گیا۔ اس کی رہائش فلیٹی ہوٹل میں تھی۔ شام گئے تک مجھے کام کرتا دیکھ کر بہت خوش ہوا اور فوراً میری تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔ پوچھنے لگا کہ یہ بتاؤ کہ تم نے اب تک کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں؟ میری طرف سے نفی میں جواب دینے پر کہا کہ اسی وقت میرے ساتھ کار میں بیٹھو اور مجھے لے کر شیزان ہوٹل میں آ گیا۔ میں نے دل میں کہا! واہ مولیٰ کہاں ملتان جیل اور کہاں شیزان ہوٹل کی موجیں! چنانچہ شیزان کے کھانوں کا لطف اُٹھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

کچھ عرصے بعد میری ٹرانسفر سائٹ پر ہوگئی اور مزید ترقی بھی مل گئی۔ اُن دنوں ہماری کمپنی کھاریاں، لال کُرتی، داؤد خیل اور مکڑوال میں بورنگ کا کام کر رہی تھی جو بعد میں K2 والے کرنل عطاء اللہ صاحب نے خرید لی تھی۔ پھر چند سال بعد مجھے منگلا ڈیم پراجیکٹ میں ایک بہت اچھا کام مل گیا۔ وہاں جون 62 تک کام کیا اور پھر میں U.K چلا آیا۔

رشید! لو ایک دلچسپ واقعہ بھی سنتے چلو۔ دراصل بچپن سے ہی میری خُو ایسی تھی کہ میں کسی کے ساتھ ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر برداشت نہ کر سکتا تھا اور مظلوم کی مدد کے لئے میں عواقب سے بے پرواہ ہو کر خطرات میں کُود جایا کرتا تھا۔ اس قسم کے واقعات کی فہرست اگرچہ طویل ہے۔ ایک کا تذکرہ تو یہاں U.K کے انگلش اخبار نے بھی کیا تھا۔ مگر یہ واقعہ جو میں اس وقت بتانے لگا ہوں وہ ملتان جیل سے رہائی کے قریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد پیش آیا۔ ہوا یوں کہ مجھے معلوم ہوا کہ دو احمدی دوست یوسف اور نواب خان ابھی تک جیل میں ہیں۔ یہ دونوں بڑے میاں صاحب کی میکلوڈ روڈ پر اسلحے کی دوکان پر سیلز مین تھے۔ چونکہ میں خود جیل میں رہ چکا تھا اس لئے معلوم تھا کہ جیل میں قیدی کے نام خط کا آنا یا کسی کا ملنے آنا ہوا کے ٹھنڈے جھونکے سے کم نہیں ہوتا۔ اندر کی فضا میں تو دم گھٹتا ہے۔ چنانچہ میں ان سے ملنے کے لئے سنٹرل جیل گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ وہاں میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک عورت رو رہی تھی لگتا تھا کہ جیل میں اپنے بیٹے، بھائی یا خاوند کو ملنے آئی ہوگی۔ ایک جیل وارڈن اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ عورت سسکیاں لے رہی تھی اور یہ بد باطن اپنی شیطانیوں سے باز نہیں آ رہا تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہوا۔ میں نے وارڈن سے کہا کہ یار اسے معاف کرو اور یہاں سے جاؤ۔ مگر اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور عورت کو بدستور چھیڑتا اور تنگ کرتا رہا بلکہ میرے منع کرنے پر مجھے بھی دو چار غلیظ گالیاں سنا ڈالیں۔ رشید! جب وہ اپنی خباثت سے باز نہ آیا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اس پر جھپٹ پڑا۔ اور چند ہی لمحوں میں اس کا وہ حال کر دیا کہ وہ زمین پر ادھ مُوا پڑا تھا۔ باہر جانے کا دروازہ کھلا تھا اور وہاں کوئی سنتری بھی موجود نہ تھا۔ میں گیٹ سے باہر نکل گیا جب تک تین چار وارڈن وسلیں بجاتے ہوئے میرے تعاقب میں آئے تو اس وقت تک میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ وہ سڑک جو چرچ کے پاس سے ریگل سینما کی طرف جاتی ہے وہاں مجھے ایک ٹانگہ مل گیا۔ وہ جیل کی طرف سے ہی آ رہا تھا اور سارا واقعہ بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹانگہ روک لیا۔ میں اس پر سوار ہو گیا۔ شاید دیکھنے والے لوگ مجھے مفرور قیدی خیال کر رہے تھے۔ میو ہسپتال کے قریب پہنچ کر میں ٹانگے سے اتر گیا اور اپنے ٹھکانے پر جا پہنچا۔ جو کچھ میں نے وہاں کیا اس کا انجام بہت خطرناک بھی ہو سکتا تھا کیونکہ وارڈن باوردی تھا اور آن ڈیوٹی تھا۔ مجھ پر سخت دفعات لگ سکتی تھیں اور میں دوبارہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو سکتا تھا۔ ایسا کام دو ہی قسم کے لوگ کر سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو مردِ مومن ہو یا دوسرا مجھ سا دیوانہ جو ایسے مواقع پر عقل کو آزاد چھوڑ دے اور انجام سے بے پرواہ ہو جائے۔ اقبال نے شاید عقل کے بارے میں ایسے ہی مواقع کے لئے کہا تھا کہ اسے ''کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دے''

وہ دونوں دوست اس واقعے کے جلد بعد ہی رہا ہو گئے۔ ایک جمعے پر مجھے ملے تو بتانے لگے کہ وارڈن کی چیرہ دستی سے بچانے پر وہ عورت تمہیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں دے رہی تھی۔ جیل کے قیدی اور visitors بھی۔ شاید اسی لئے اللہ نے مجھے بچا بھی لیا۔

رشید! سرِ دست 53 کے حالات اور مارشل لاء کے واقعات کے بارے میں مختصراً بیان کیا ہے۔ اگر کبھی موقعہ ملا تو دیگر واقعات بھی تمہیں سناؤں گا۔ میری املا میں بہت غلطیاں ہوں گی۔ کئی الفاظ پڑھنے بھی مشکل ہوں گے مگر تم عبدالکریم مرحوم کے بھائی ہو، وہ شارٹ ہینڈ کا ماہر تھا۔ امید ہے تمہارے لئے کوئی مشکل نہ ہوگی۔ والسلام۔

مظفر احمد (جیجھو) آف دارالفضل قادیان حال لنڈن

المنار "alislam.org" پر

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب المنارای گزٹ جماعت کی ویب سائٹ ''الاسلام ڈاٹ آرگ'' پر Periodicals سیکشن میں شامل ہے۔ خود بھی اس سے استفادہ کریں اور اپنے حلقہ احباب میں بھی اس کو متعارف کروائیں۔

ایک تو میں بیمار ہوں اور دوسرے آپ میری خبر لینے آ گئے ہیں

تعلیم الاسلام کالج میں سینئر اساتذہ بہت لائق اور تدریس کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔مکرم چوہدری حمیداللہ صاحب اور مکرم محمد ابراہیم صاحب ناصر کا شمار ریاضی کے بہترین اساتذہ میں ہوتا تھا۔مکرم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب انگریزی لٹریچر کی تدریس پر مکمل عبور رکھتے تھے۔زمانہ طالب علمی میں آپ سے ڈرامہ شیکسپیئر اور Eight Poets پڑھنے کا اتفاق ہوا۔آپ کی تدریس کا انداز بے حد دلچسپ اور عالمانہ ہوتا تھا۔ خصوصاً ڈرامہ شیکسپیئر کے بارہ میں آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ متعدد Criticism کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی اپنا لیکچر تیار کرتا ہوں۔آپ لیکچر دیتے اور ہم کتاب پر ہی ساتھ ساتھ نوٹس لیتے جواب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔مکرم کنور ادریس صاحب کی تعیناتی کالج ہذا میں بطور انگریزی لیکچرار ہوئی۔آپ نے پہلے روز ہی کلاس میں طلباء کو نصیحت فرمائی کہ خلاصے اور گائیڈوں سے بے نیاز ہو کر اپنے استاد کے لیکچرز کے نوٹس لیں۔آپ کالج میں نہایت قلیل مدت تک رہے۔اور CSS کا امتحان پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔لیکن ان کی نصیحت کو ہم نے پلے باندھ لیا۔مکرم چوہدری محمد علی صاحب فلسفہ کے استاد تھے۔خوبصورت اور معیاری انگریزی لکھنے اور بولنے کے ماہر تھے۔آپ کو ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بھی مقرر کیا گیا۔آپ کی رہائش گیسٹ ہاؤس میں تھی شاعرانہ اور ادبی ذوق کے ساتھ آپ کی طبیعت میں مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا تھا جس کا مجھے تجربہ ہوا۔ایک دفعہ آپ کی علالت کی خبر سن کر ہم چند دوست عیادت کیلئے چلے گئے۔ میری نئی نئی تقرری ہوئی تھی۔شاید آپ میری تقرری سے واقف نہ تھے۔مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ کیسے تشریف لائے ہیں۔ناتجربہ کاری کی بناء پر میرے منہ سے نکل گیا کہ آپ کی خبر لینے آیا ہوں۔چہرے پر مصنوعی غصہ ظاہر کر کے فرمانے لگے ایک تو میں بیمار ہوں اور دوسرے آپ میری خبر لینے آ گئے ہیں۔جب میں نے وضاحت کی تو فرمانے لگے کہ میں آپ کی بات سمجھ گیا تھا۔میں نے ناحق آپ کو پریشان کیا۔

مکرم صوفی بشارت الرحمٰن صاحب شعبہ عربی کے صدر تھے۔اس کے علاوہ آپ چیف پراکٹر بھی تھے۔آپ کا شمار کالج کے ابتدائی پروفیسروں میں ہوتا تھا۔طلباء کے نزدیک آپ ایک سخت گیر استاد تھے۔حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔آپ ایک حساس دل کے مالک تھے۔آپ کا پڑھانے کا انداز دلنشین اور منفرد ہوتا۔آپ کی ہومیوپیتھی کی ذاتی ڈسپنسری تھی۔بورک اور ٹیفل کمپنی کی تمام ضروری ادویات آپ کے پاس موجود ہوتیں۔اور ضرورت مند طلباء کو فراخ دلی کے ساتھ یہ ادویات دیتے۔محلہ کی مسجد میں قرآن اور حدیث کا درس باقاعدگی کے ساتھ دیتے۔معاشیات کے پروفیسر مکرم ظفر احمد وینس اپنے مضمون پر مکمل عبور رکھتے تھے۔آپ طلباء کی بے حد حوصلہ افزائی فرماتے اور ان میں معاشیات کے مطالعہ کا شوق پیدا کرتے۔پروفیسر مکرم محمد ابراہیم صاحب ناصر چائے کے وقفہ میں اپنے ہاتھ سے چائے بنا بنا کر بڑے خلوص سے تمام سٹاف ممبران کو پیش کرتے۔آپ کی تیار کردہ دارجلنگ چائے کا مزہ اب تک یاد ہے۔آپ خود دو کپ چائے پیتے یعنی آخری کے بھی آپ ہی حقدار ہوتے۔پروفیسر ڈاکٹر سلطان محمود شاہد صاحب بے حد حلیم الطبع انسان ہیں۔آپ طالب علم ہوں یا پروفیسر ہر ایک کی بات بڑے غور اور ہمدردی سے سنتے اور سب کے کام آ کر خوشی محسوس کرتے۔

مکرم شیخ محبوب عالم خالد صاحب (شعبہ اردو)، مکرم پروفیسر ڈاکٹر خان نصیر احمد خاں صاحب (شعبہ فزکس)، مکرم خان حبیب اللہ خاں صاحب (شعبہ کیمسٹری)، مکرم مسعود احمد عاطف صاحب (شعبہ فزکس)، مکرم عبدالرشید غنی صاحب (شعبہ ریاضی)، مکرم سلطان اکبر صاحب (شعبہ عربی)، مکرم چوہدری محمد شریف خالد صاحب (شعبہ انگریزی) مکرم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب (شعبہ اردو) کا شمار محنتی اور قابل اساتذہ میں ہوتا تھا۔مکرم ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب تدریس کے علاوہ کالج کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے روح رواں بھی تھے۔تعلیم الاسلام کالج کے لائق اور قابل فخر اساتذہ کی فہرست تو بہت طویل ہے لیکن اس مختصر مضمون میں تمام اساتذہ کرام کا ذکر ممکن نہیں۔(الفضل 28 جنوری 2011)

مکرم پروفیسر عزیز احمد طاہر صاحب

دو نوافل کی تحریک

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اپنے خطبہ جمعہ بیان فرمودہ مؤرخہ 3 دسمبر 2010ء میں احباب جماعت کو روزانہ کم از کم دو نوافل ادا کرنے کی تحریک کرتے ہوئے فرمایا:

”پس ان حالات میں دنیا بھر کی جماعتوں کے تمام افراد کو میں خاص طور پر اپنے مظلوم اور تکلیف اور مشکلات میں گرفتار بھائیوں کیلئے دعاؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔کم از کم دو نفل روزانہ صرف ان لوگوں کیلئے ہر احمدی ادا کرے جو احمدیت کی وجہ سے کسی بھی قسم کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔جو ظالمانہ قوانین کی وجہ سے اپنی شہری اور مذہبی آزادیوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔اسی طرح جماعتی ترقی کیلئے بھی خاص طور پر دعائیں کریں۔پس اگر ہر احمدی اپنے دل کی بے چینی کو خدا تعالیٰ کے حضور پہلے سے بڑھ کر پیش کرے گا تو خود مشاہدہ کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کے پیار کی نظر اس پر کس طرح پڑ رہی ہے۔پہلے سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے حصار میں لے لے گا۔“

(روزنامہ الفضل ربوہ مؤرخہ 4 جنوری 2011ء)

شگفتہ شگفتہ

اُستاد امام الدین گجراتی

اصل نام امام الدین، تخلص استاد۔ 1870 میں پیدا ہوئے۔ 1954 کو گجرات میں وفات ہوئی۔ تعلیم پرائمری۔ میونسپل کمیٹی میں محصول چنگی پر منشی گیری کرتے رہے۔ شاعری کا آغاز 1902 سے کیا۔ مجموعہ کلام بانگِ دُہل" کے نام سے شائع شدہ ہے جس کے دیباچے میں مکرم ملک عبدالرحمن صاحب خادم نے ان کے تعارف میں لکھا ہے کہ:-

استاد کے کلام کی قبولیت اور شہرت ہوئی اور خوب ہوئی۔ بچے بچے کی زبان پر استاد کے شعر جاری ہو گئے۔ استاد کے مشاعرہ گاہ میں قدم رکھتے ہی ہال دیوارِ قہقہہ بن جاتا۔ لوگ خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتے۔ اور چھت شگاف نعروں اور بہجت خیز تالیوں سے استقبال کیا جاتا۔ استاد! استاد! کہہ کر صاحب صدر کو مجبور کیا جاتا کہ حضرت استاد کے کلام سے مشاعرے کا افتتاح کیا جائے۔ استاد کے کھڑے ہوتے ہی ایک عالمِ محشر بپا ہو جاتا۔ آخر انہی قہقہوں کے شور میں استاد اپنا کلام معجز نظام پڑھنا شروع کرتے تو اس کی داد حاضرین تالیاں بجانے، ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے اور ایک دوسرے پر بے طرح گرنے سے دیتے۔ ذیل میں استاد کے کلام میں سے منتخب اشعار قارئینِ المنار کی تفنن طبع کے لئے پیشِ خدمت ہیں:

ہٹلر کا والد یا ماں سَپ رہا ہے
خلف جن کا ناخلف یوں ٹپ رہا ہے
افسوس خلقِ خدا کپ رہا ہے
نہ کوئی روکتا نہ اُسے نپ رہا ہے

❁

اُنّی سو اٹھنّی کو کیا دیکھتے ہیں
مرگِ اقبال موت و قضا دیکھتے ہیں
چھایا اندھیرا ہے سب کی نظر میں
شمع گیس قومی بجھا دیکھتے ہیں

❁

مجنوں نہیں رہا کہ میں لیلیٰ نہیں رہا
ناقہ نہیں رہا کہ میں محمل نہیں رہا
تنزل نہیں رہا کہ معطل نہیں رہا
عرصہ ملازمت میں مسلسل نہیں رہا
بی اے نہیں رہا کہ میں ایل ایل نہیں رہا
عہدہ وہ کون سا ہے جو حاصل نہیں رہا

❁

حاضرین نے قہقہہ لگایا تو.....

''مرزا غالب مشکل گو شاعر بھی تھے اور فلاسفر بھی۔ لیکن جب جام دو آتشہ کے نشہ میں شعر کہتے تھے تو کبھی کبھی لفظ یا فقرہ شعر میں محذوف بھی ہو جاتا تھا۔ اگر چہ کھینچ تان کر اس شعر کے معنے تو نکل سکتے تھے مگر اس کھینچا تانی کے لئے بھی ماڈرن دماغ ہی چاہئے تھا۔ شاعر پرستی بھی ایک فیشن ہے۔ اس موجودہ زمانہ میں جب غالب ہر دلعزیز ہو گئے ہیں تو ہر شخص خواہ لائق ہو یا نالائق ان کی تائید کرنے لگا ہے۔

بے معنی اشعار کے معنی نکلنے لگے ہیں اور ٹٹ پونجئے بھی غالب دان بن گئے ہیں۔ جو باتیں مومن، ذوق اور دیگر ائمۃ الشعراء کی سمجھ میں نہ آئی تھیں وہ آج کل کے سینما بین نوجوانوں کو نظر آنے لگیں۔ ..... میرا یہ مطلب نہیں کہ غالب معمولی شاعر تھے مگر بعض اشعار ان کے مشکل اور دقیق اور بعض واقعی بے معنی ہوا کرتے تھے اور سب اہل الرائے ادیبوں اور شاعروں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے مگر آج کل ایک فرقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو ان کو ناواجب طور پر آسمان پر چڑھا رہا ہے۔ انہی میں سے ایک ہمارے دوست محمد جی صاحب بھی تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ''واہ غالب ظالم غالب تیرا کلام کیسا عجیب ہے۔ میرے نزدیک تو تیرا ایک شعر بھی بے معنی نہیں ہے۔ ایک بندش بھی بغیر خوبی کے نہیں ہے۔ وہ لوگ بدتمیز، بے علم اور احمق ہیں جو تیرے اشعار کو مشکل یا بے معنی کہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھیں تو میں ان کو تیرے اشعار آبدار کی تفسیر کر کے بتاؤں''۔

جولائی ۱۹۰۶ کا زمانہ تھا۔ ایک دن جب میں ان کے ایسے فقرے سنتے سنتے تھک گیا تو ان سے عرض کیا کہ ''بھائی محمد جی صاحب ہمارے پاس بھی آپ کے مکرم و محترم غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل ہے۔ جب جانیں تم اس کے صحیح معنی کرو ورنہ شیخی بگھارنا کوئی خوبی نہیں''۔ کہنے لگے ابھی لائیے ابھی۔ میں نے عرض کیا کل پیش کروں گا۔ چنانچہ رات کو ہماری پارٹی نے غالب بن کر انکی طرز کی ایک غزل بنائی۔ اس سازش میں تین چار آدمی شریک تھے۔

دوسرے دن جب محمد جی صاحب تشریف لائے تو ہم نے وہ غزل پیش کی۔ پہلے تو دیر تک اسے پڑھتے رہے۔ پھر فرمانے لگے ''بے شک ہے تو یہ غالب ہی کی'' پھر جھومنے لگے ''واہ کیا کلام ہے۔ کیا باریک نکات ہیں۔ کیا الفاظ کی بندش ہے۔ کیا گہرائیاں ہیں۔ کیا معانی ہیں۔ بس قربان ہونے کو جی چاہتا ہے''۔

یہ کہہ کر انہوں نے ایک ایک شعر کی باریکیاں اور معنی بیان کرنے شروع کئے۔ جب آخری شعر کی تفسیر سے فارغ ہوئے تو حاضرین نے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر تالیاں پیٹیں اور آخر میں تین دفعہ ہپ ہپ ہرے کا نعرہ بلند کیا۔ محمد جی صاحب بیچارے پریشان سے ہو گئے۔ کہنے لگے کہ کیا بات ہے۔ آخر جب اصل بات معلوم ہوئی تو شرمندگی کے مارے ان کی یہ حالت ہو گئی کہ جیسے گھڑوں پانی سر پر پڑ گیا ہو۔ بار بار پوچھتے تھے کہ مجھے سچ بتاؤ واقعی یہ غزل غالب کی نہیں ہے کہیں مجھے بنا تو نہیں رہے۔ مگر جب انہیں یقین آ گیا تو پھر ایسے فرو ہوئے کہ مدتوں تک ان کی زیارت نصیب نہ ہوئی''۔ (حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب کی ''بخار دل'' سے اقتباس)

باباشادی

(مکرم پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان صاحب۔امریکہ)

کالج کے برامدے میں "شادی""شادی" کی صدا گونج رہی تھی۔یہ سُن کر مکرم صوفی بشارت الرحمن صاحب اپنے کمرے سے باہر نکلے اور برادرم پروفیسر شکور اسلم صاحب (جو کسی کام کے سلسلے میں بابا شادی کو تلاش کرتے ہوئے اُس کا نام پکار رہے تھے) سے ہنستے ہوئے مخاطب ہوئے اور فرمایا "بھئی صبر کرو! اتنی بھی کیا بے تابی ہے آخر اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہو جائے گی تمہاری شادی۔اور اتفاق دیکھئے کہ کچھ دنوں بعد ہی شکور اسلم صاحب کی شادی مکرم صوفی صاحب مرحوم کے ذریعے ان کی ایم اے عربی کی ایک طالبہ سے طے پاگئی۔

تعلیم الاسلام کالج کی حسین یادوں میں جہاں کالج میں گزارے ہوئے دن توشہ ءزندگی ہیں وہاں بابا شادی ایک ایسا کردار ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔مجھے کالج میں اپنی طالبِ علمی اور بطور استاد گزارے ہوئے دن یاد آتے ہیں تو میں باباشادی سے متعلق یادوں کو دیگر یادوں سے الگ نہیں کر پاتا۔شادی کالج کا اٹوٹ انگ تھا۔جب چھٹی پر جاتا کالج پر ایک اُداسی سی چھائی رہتی گھنٹی آگے پیچھے بجتی، چائے کے رسیا ٹک شاپ پر جا کر چائے پیتے۔شادی کی غیر حاضری میں لیبارٹری اسسٹنٹس کی ڈیوٹی لگتی ہر کوئی گھبرایا ہوا ڈیوٹی بدلوانے کی کوشش کرتا۔

کالج کے برآمدے میں چلتے ہوئے طلباء کی باتوں اور ان کے قدموں کے شور سے بے نیاز بابا شادی اپنی پتلی سی آواز میں خود کلامی کرتا ہوا گزر جاتا۔سر تا پا سادگی کا مجسمہ، ناٹا سا قد، گندم گوں رنگ، منحنی جسم، ہلکی سفید مونچھیں، گول منڈا ہوا سر، چھوٹی پھینی سی چائنیز ناک پر بار بار پھسلتی ہوئی عینک، جسے وہ بار بار ہاتھ کے ٹھونکے سے آنکھوں کے سامنے دھکیلتا رہتا۔

دیسی طرز کی کھلی قمیض اور تہبند لنگوٹی کی طرز پر اس طرح پہنتا کہ آدھی پنڈلیاں نظر آتیں۔پاؤں میں ایڑی بیٹھی ہوئی دیسی مونچھ دار بے رنگ جوتی پہنے ہوئے جب چلتا تو ایڑی کے ساتھ ٹکرا کر تالی جیسی خاص آواز پیدا کرتی۔سردیوں میں موٹے کھیس کی بُکل مارے رکھتا اور لمبی جرابیں پہن لیتا جن سے اس کی ننگی پنڈلیاں چھپُ جاتیں۔خود دار اتنا کہ کسی سے کوئی چیز مانگ کر نہ لیتا۔دلجو ایسا کہ ذرا سی صلح مارنے پر چائے کی پیالی خوشی سے پی لیتا۔دن کے چوبیس گھنٹے اور ہفتہ کے ساتوں دن ڈیوٹی پر رہتا۔کالج بند ہونے پر سارے کالج کا گشت کرتا۔کمروں کے تالوں کو کھینچ کھینچ کر تسلی کرتا کہ کہیں کھلے تو نہیں رہ گئے۔اگر کسی لیبارٹری کا تالا کھلا پاتا تو اپنا تالا لگا دیتا اور اگلے دن متعلقہ لیبارٹری اسسٹنٹ کے خوب لتے لیتا۔شادی کی صاف دلی، ایمان داری اور ہمدردی کے باعث کالج کا تمام سٹاف شادی کی عزت کرتا اور کہا مانتا تھا۔

کالج میں چھٹی کے بعد اپنی جھل مل سی چار پائی دفتر کے پاس برآمدوں کے سنگم پر بچھا لیتا۔دورانِ کالج حقہ پینے کی مناہی کے باعث اس عیاشی کے لئے بڑے صبر سے چھٹی کا انتظار کرتا۔چھٹی کی گھنٹی بجانے کے ساتھ ہی باہر درختوں سے گری پڑی سوکھی ٹہنیوں کو توڑ کر آگ جلاتا۔پانی کی ٹونٹی سے حقہ تازہ کرتا۔پھر چلم میں آگ بھر کر مزے سے چار پائی پر لیٹ کر حقے کے لمبے لمبے کش لیتا۔دیگر محققین حُقہ بھی شادی کے ساتھ اس کی اس ضیافت میں شریکِ محفل ہو جاتے۔

کالج کے گیٹ کواڑوں کے بغیر تھے۔کالج میں تعطیل ہوتے ہی ارد گرد کے آوارہ کتے شادی کے مہمان ہوتے اور شادی ہوسٹل کا مہمان۔اپنا برتن لے کر کھانا لے آتا۔کھانے کی خوشبو پر کتے شادی کی چار پائی گھیر لیتے۔شادی خود بھی کھاتا اور انہیں بھی کھلاتا۔کتوں کو مختلف ناموں سے پکارتا۔ہر کتے کا نام لے کر روٹی کا ٹکرا اس کی طرف پھینکتا "لے ڈبو" اگر کوئی اور کتا ٹکڑا اُچک لیتا تو اسے خوب جھڑکتا۔یہ مہمان رات بھر شادی کی چار پائی کے پاس پاؤں پسارے پڑے رہتے۔جونہی کوئی کھڑکا ہوتا تو بھونکتے اور اس طرح شادی کے کام کو آسان کر دیتے اور کالج کھلنے کے ساتھ ہی غائب ہو جاتے۔جب اس باہمی پیار سے کتوں کی تعداد کچھ زیادہ ہوگئی تو اپنے اور بیگانوں کی تمیز اٹھ گئی۔اس پر کالج انتظامیہ کو کتوں کا داخلہ بند کرنا پڑا۔جس سے شادی کچھ عرصہ اداس رہا مگر جلد سنبھل گیا۔

اکثر میرے پاس لیبارٹری میں آجاتا۔مختلف موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ایک دن میں نے اس کی شادی کے متعلق سوال کیا۔شادی دکھی سا ہو گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "ہاں کی تھی، بچہ پیدا ہوا، مر گئی، بچے کو بھی ساتھ لے گئی"۔آنسوؤں سے گیلی عینک اتار کر قمیص کے دامن سے صاف کرنے لگا۔

شادی کے بھانجے بھتیجے پل گیارہ کے پاس کسی گاؤں میں رہتے تھے۔شادی کبھی کبھار کالج سے تین چار دن کی چھٹی لے کر صاف ستھرے کپڑے پہنے بچکی سونٹے کے سرے پر لٹکا کر شانے پر رکھ لیتا اور اسٹیشن کا رستہ لیتا۔اس کے جانے کے بعد کالج پر خاموشی اور افسردگی چھا جاتی۔

اب یہ سوال کہ شادی کالج میں آیا کہاں سے؟ کیا کالج نے شادی کو ڈھونڈا یا شادی نے کالج کو؟ یہ ایک دقیق سوال ہے۔اغلباً جب تعلیم الاسلام کالج لاہور میں ڈی۔اے۔وی کالج کی عمارت میں منتقل ہوا تو شادی کا خاندان مہاجرت کے بعد متروکہ کالج میں پناہ لئے ہوئے تھا۔عمارت سے بے دخلی کے بعد جب یہ لوگ کہیں اور منتقل ہو گئے تو اس وقت شادی کی مفلوک الحالی اور سادگی کو دیکھتے ہوئے اسے اور اس کے ایک بھائی کو کالج کی ملازمت میں لے لیا گیا۔بھائی تو کچھ عرصے بعد کالج چھوڑ گیا، جبکہ کالج شادی کو اور شادی کالج کو راس آگیا۔کالج کے لوگ بھلے تھے اور شادی بھلا مانس۔چنانچہ یہ بندھن 1984 تک قائم رہا۔

شادی ہندوستان کے نابھہ پٹیالے کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔اپنے علاقے کے مخصوص لہجے میں بات کرتا، الفاظ صحیح تلفظ سے ادا نہیں کر سکتا تھا، اس کی اپنی طرز کی ادائیگی پر اکثر سٹاف روم میں زوردار قہقہہ پڑتا اور بے چارہ شادی کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ جاتا۔

شادی طلباء اور اساتذہ میں یکساں مقبول تھا۔شادی کو دیکھتے ہی ہر کسی کا دل مزاحیہ فقرے لڑھکانے کے لئے مچلتا۔شادی ماحول کے مطابق جواب دیتا وگرنہ مسکرا کر کنی کترا جاتا۔اکثر شرارتی طلباء شادی سے لاہور دکھانے کا مطالبہ کرتے۔۔۔۔اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

1974 میں کالج کے قومیائے جانے کی حماقت نے جہاں کالج میں رائج محبت و ہم آہنگی کا تانا بانا بکھیر کر رکھ دیا وہاں بے اعتباری اور شکوک وشبہات کا عفریت بھی کالج کی پرانی روایات کو دیمک کی طرح چاٹ گیا۔کالج کی نئی انتظامیہ اور سٹاف میں نفاق کی دراڑیں گہری ہوتی چلی گئیں۔شادی جیسا شریف النفس بھی دلبرداشتہ ہو کر دل ہار گیا اور بجھا بجھا اور بیمار بیمار سا رہنے لگا۔اسی رولے گولے میں شادی ہوا کے جھونکے کی طرح اچانک غائب ہو گیا۔کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ شادی کی وفات ہو گئی ہے۔شادی جو تعلیم الاسام کالج کی پیار و محبت کی فضا میں اٹھلاتا ہوا خوش رنگ پھول تھا، نفرتوں کی مسموم ہوا اور شکوک وشبہات کے جہنم میں جھلس گیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔حق مغفرت کرے عجب پیار کرنے والا وجود تھا!